محشرِ خیال

— فنونِ لطیفہ اور ادبِ عالیہ کے
آفاقی کردار سے متعلق ایک مقالہ —

از

سید تصدق حسین

بی۔ ایس۔ سی۔ ایل ایل۔ بی (علیگ)
ایڈوکیٹ

★

قیمت: تین روپے

ناشر

مجلس تحقیقاتِ اردو، کشمیر (سرینگر)

کتابت: محمد عبد السلام خوشنویس

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ چارکمان۔ حیدرآباد ۲۔ فون: ۴۲۷۰۴

ہر لحظہ نیا شوق، نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اِنتساب

ابراہیم شہداد اور لئیق احمد قریشی

کے نام

جو میری روح اور میرا دماغ ہیں۔

آبلہ پائی نے سارا دشت افشاں کر دیا
جب بہار آئی یہ نقشہ دیکھ کر شرما گئی

(سیّد تصدّق حسین)

پیش لفظ

جناب پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب صدر شعبۂ اردو جموں و کشمیر یونیورسٹی

جناب تصدق حسین صاحب کشمیر کے ایک شستہ ادبی مذاق رکھنے والے صاحبِ فکر نوجوان ہیں۔ کشمیر سے انھوں نے بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد اپنی دلچسپی کے مدنظر علیگڈھ سے ال ال بی کا امتحان پاس کیا اور اب سری نگر میں وکالت کر رہے ہیں۔ بہت تھوڑے عرصے کے اندر اندر اپنی ذہانت اور کارکردگی کی بدولت، وہ کشمیر کے سربرآوردہ وکیلوں میں شمار ہونے لگے ہیں اور زاید پبلک پراسیکیوٹر کے عہدہ پر بھی فائز رہ چکے ہیں۔

ان بظاہر غیر ادبی مشغولیتوں کے باوجود ان کا ادبی ذوق پروان چڑھتا رہا۔ ادبی ذوق اصل میں ایک فطری ذوق ہے،

اور بعض وقت غیر اَدبی ماحول میں وہ زیادہ چمک اُٹھتا ہے تصدّق صاحب کی صورت میں کچھ یہی ہوا ہے، جس کا ثبوت ان کا یہ گُوبی رسالہ ہے، جس میں انھوں نے حیات، سماج اور ادبیات کے مسائل پر بڑے مُفکرآنہ انداز سے روشنی ڈالی ہے اور ان کے آپسی تعلقات اور ایک دوسرے پر رَدِّ عمل کا مطالعہ بڑی دِقّتِ نظر سے کیا ہے۔ اِس وسیلے سے اُنھوں نے اَدب کے تخلیقی عمل کی کُنہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ ان مسائل پر سوچتے ہوئے وہ اپنے عصر کے نعروں کے ساتھ انجذاب گرایانہ کا روّیہ اختیار نہیں کرتے، بلکہ خود اپنے ذہن سے سوچنے اور نتیجوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان مسائل پر غور و فکر کرتے ہوئے وہ ایک پتے کی بات کہتے ہیں کہ:

> "یہ چند لوگ جو فن کی طبقاتی تقسیم کرنا چاہتے ہیں، فن کی پاکیزگی، عفّت، تقدّس اور لطافت بلکہ اَدا کی ہزار شیوہ نیرنگیوں کو اپنی کم نظری کے باعث مستحکم حدود میں، بلکہ صلابت سلاسل میں جکڑ دینا چاہتے ہیں، وہ پھول سے اس کی خوشبو کی لطافت اور رات سے اس کی سیاہی کی عظمت اور صبح سے اس کی درخشندگی کا حُسن چھین لینا چاہتے ہیں۔"

محض نظریوں کے ساتھ بندھے ٹکے اور دوسروں کے ذہن سے سوچنے والے تخلیق کاروں اور نقادوں کی سرزنش کرتے ہوئے تصدق صاحب کہتے ہیں :-

"آج کا تخلیق کار اپنے فرائض کو بھولتا جا رہا ہے، وہ ادبیاتِ عالیہ یا فنونِ لطیفہ کے آفاقی کردار سے پوری طرح آشنا نہیں"

تصدق صاحب کے بعض نتائج سے ممکن ہے کہ کسی کو اختلاف ہو، لیکن ان کے اندازِ فکر کے خلوص کے بارے میں کسی کو شبہ نہیں ہوسکتا۔ کشمیر کے قدرتی حسن اور اس کی رعنائیوں کی طرح کشمیر کی ذہانت بھی بڑی قابلِ اعتنا چیز ہے اور اِس حقیقت کا مجھے اب زیادہ سے زیادہ اندازہ ہوتا جا رہا ہے۔ تصدق صاحب اس کشمیرِ جدید کے صاحبِ فکر و نظر نوجوان ہیں؛ جو اُردو اَدب میں دُنیائے فکر و فن پر اپنے تاثرات مُرتسم کرنے کے لیئے تیار ہو رہے ہیں۔ اِس سے قبل بھی کشمیر یا کشمیر سے نکلے ہوئے اہلِ قلم اُردو اَدب کے مختلف جہات پر اپنا سِکّہ بٹھا چکے ہیں۔

تصدق صاحب کے اسلوبِ نگارش پر جہاں شرر اور کچھ ادبِ لطیف کے علمبرداروں کا کلاسیکی انداز غالب دکھائی دیتا ہے مولانا ابوالکلام آزاد جیسے جدید ادیبوں کی طرزِ نگارش کی بھی، پرچھائیں پڑتی معلوم ہوتی ہیں۔ اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے

کہ عام تصور کے مطابق کسی اَدبی ادارے سے متعلق نہ ہونے کے باوجود جنابِ تصدّق حسین صاحب کا ذوقِ ادب قابلِ قدر ہے۔ اپنی ذہنی کاوشوں کا جو ماحصل انھوں نے اِن اَوراق میں پیش کیا ہے، وہ کشمیر میں اُردو اَدب کے مُستقبل کے بارے میں میری خوش آیند توقعات سے کہیں زیادہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُردو دُنیا، اِس سعئِ جمیلہ کا بڑی مَسرّت کے ساتھ خیر مقدم کرے گی اور تصدّق صاحب اور کشمیر کے دوسرے اہلِ قلم حضرات کی کاوِشوں کی مُنتظر رہے گی۔

عبدالقادر سروری

سری نگر۔ کشمیر

۲۳ر فروری ۱۹۶۶ء

حرفِ اوّل

مزاجِ بندگیٔ عصرِ نَو کی تجھ کو قسم
نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر
(جوشؔ)

شاعر وقت کی آواز ہوا کرتا ہے۔ نئے مزاج کے پروردگار کا نعرہ شاعرانہ تعلّی ہی نہیں وقت کا تقاضا بھی ہے۔ آج کا انسان درسِ حیات کا ایک اہم سبق سیکھ رہا ہے کہ انسانیت، فرقہ، قبیلہ، قوم، نَسل یا مُلک کی خیالی سرحدوں میں بٹ کر رہ نہیں سکتی۔ زندگی مائل بہ پرواز ہے اُن رفعتوں پر جنھیں یہ دیواریں عبور نہیں کرسکتیں۔ یہ بلندیاں شش جہت کی قید سے آزاد ہیں۔ نہ کوئی سمت ہے اور نہ کوئی فاصلہ! قوموں اور فرقوں کی قید ختم ہو چکی ہے۔ مذہب اور

فرسودہ رسم ورواج کی بندشیں ٹوٹ چکی ہیں۔ یہ آدمیت کی ہی نہیں، اِنسانیت کی بھی نہایت اَرفع منزل ہے کہ ہمارے بیشتر اصول آفاقیت کے تصوّر پر مبنی ہیں۔

ضرورت ہے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں ان قدروں کا ازسرِ نَو جائزہ لیا جائے۔ یہاں پر ہم اِس بات کی طرف توجہ دلائیں گے کہ آفاقی کردار کا جائزہ لیتے وقت حقیقت پسندی (Realism) اور آدرش پسندی (Idealism) کے نظریۂ حیات کی محک پر ہی ان گراں مایہ اقدار کو پرکھا جاسکتا ہے۔ آج کل کے سائینسی اِستدلال کے مطابق حقیقت پسندی اور آدرش پسندی کے درمیان حدِ فاصل نہیں کھینچی جاسکتی۔ یہ دونوں فلسفے ایک دوسرے سے مُنطبق نظر آتے ہیں۔ دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا رِشتہ ہے۔

حقیقت پسندی دراصل آدرش پسندی کو جنم دیتی ہے حقیقت پسندی وہ ہے جس کا حقیقت میں وجود ہے اور جس وجود کو ہمارے قویٰ تسلیم کرتے ہیں اور آدرش پسندی وہ ہے جس کا وجود ہونا چاہیئے۔ رُوسی مفکّر پلیخنوف اپنی مختصر مگر دلچسپ کتاب "آرٹ اور سوشیل لائف" میں تاریخی مادّیت اور فنونِ لطیفہ کی بحث کرتے وقت اِس غلطی کا شکار نظر آتا ہے کہ انسانی سماج نے صرف حقیقت پسندی کے نظریہ پر عمل کرکے ترقی کی ہے اور تاریخ بذاتِ خود اِس

فلسفہ کے عملی پہلو کی داستان طویل ہے۔

اس کے برعکس دوسرا طبقۂ خیال یہ ہے کہ انسانی سماج نے صرف آدرش پسندی کے فلسفہ کو اپنا کر ترقی کی ہے۔ کارلائل تو بُت پرستی شیوۂ انسانیت قرار دیتا ہے اور اُس کی نگاہوں میں انسانیت کی تاریخ آدرش Idealism کی پَروردہ ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فکر و ادراک کے یہ دونوں طبقے انتہاپسندی سے کام لے رہے ہیں۔ حقیقت پسندی کے ماننے والے آدرش کی اہمیت کو قطعاً نظر انداز کرتے ہیں اور آدرش پسند، حقیقت کی طرف وہ توجہ نہیں دیتے جو مطلوب ہے۔ انسانی سماج اور تاریخ کا ارتقا حقیقت اور آدرش دونوں کی مسلسل کاوش اور سعی کا نتیجہ ہے۔ حقیقت نے آدرش کو جنم دیا ہے، یُوں کہیئے کہ حقیقت اور آدرش میں کوئی تضاد نہیں۔ دونوں فلسفۂ حیات ایکدوسرے سے مُنسلک ہیں۔

اس بحث سے یہ صاف ظاہر ہے کہ دراصل حقیقت کی اعلیٰ ترین شکل آدرش ہے۔ جس وقت ہم اپنے آدرش کو پا لیتے ہیں تو وہ آدرش، آدرش نہیں رہتا بلکہ حقیقت بَن جاتا ہے اور پھر یہ نئی حقیقت ایک بالکل نئے آدرش کو جنم دیتی ہے۔ یہ ارتقا کے زینے کی مختلف کڑیاں ہیں، جو آج ہمارے لیئے آدرش ہے وہ آئندہ کی نسلوں کے لیئے حقیقت ہوگا۔ جنھیں آج ہم حقیقت دیکھ رہے ہیں، زمانۂ قدیم کے یہی آدرش تھے۔

ہم نے آدرش اور حقایق دونوں کے سہارے بدلتی ہوئی قدروں کا جائزہ لیا ہے۔ ہمیں ایک ایسا سماج قایم کرنا ہے جو آفاقیت اور انسانی برادری کے عظیم اصولوں پر مبنی ہو۔ چونکہ انسانی اندازِ فکر کی تشکیل سماجی ماحول کرتا ہے اور سماجی تقاضے انسانی اندازِ فکر کے لیئے مہمیز کا کام دیتے ہیں، ان اقدار کا جائزہ لینا اور بھی ضروری ہو گیا ہے کیونکہ ان کی موزونیت اور وسعت پر ہی اس نئے آفاقی سماج کی بنیادیں استوار کی جاسکتی ہیں۔

اِس طویل موضوع پر یہ مختصر سا مقالہ ایک سعی لاحاصل ہی نہیں بلکہ مصنّف کو اُمید ہے کہ کتابچہ کے شایع ہونے کے بعد وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہو گا ؎

ہے صحرا اب بھی صحرا مگر خونِ پا کا فیض
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

باب اوّل

اِنسانی تہذیب صدیوں کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ جُوں جُوں اُس کا دائرہ عمل وسیع ہوتا گیا، انسان کا نظریۂ زندگی، زندگی کے عظیم تقاضوں کو پُورا کرنے کے لیئے زمانے کی روِش کے مطابق تبدیل ہوتا گیا۔ یہی تجربات اُس کے شعور، اِدراک اور تخیّل کو وُسعت بخشتے رہے ہیں۔ یہی وُسعت وہ تغیّر یا انقلاب ہے، جس کے آستانے پر بقائے دوام صَدیوں سے یا یُوں کہیئے ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک سجدہ ریز رہی ہے۔ اِنسانی شعور میں ایک نیا انقلاب آنے کے بعد انسان اور اُس کا رُوحانی ارتقا ماورائیت کی حَدوں سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ یہ فلسفہ اب تقویم پارینہ سے زیادہ کوئی اہمیت

نہیں رکھتا۔ نئے فلسفۂ حیات کے منطقی استدلال کے مطابق انسان کسی ماورائے کائنات سے وجدان حاصل نہیں کرتا۔ بلکہ اسی کرۂ ارض کے مناظرِ حیات آفرین و حُسن خیز اس کی نگاہ کو وسعت اور اس کے تخیل کو نکھار بخشتے ہیں۔ اور اِس طرح اس کے مطمحِ نظر کے وقیع سے وقیع تر ہونے کو مفکّروں نے ارتقا اور شاعر نے کوششِ ناتمام سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ایک مسلسل عمل کی کیفیت ہوتی ہے جس کی آخری منزل دورِ حاضر کے سائینسدان کی نظر میں وحدانیت کا وجود ہے۔ جس فلسفہ کو تراشش کر ارتقا کی یہ خواہشِ انسانی تسکین حاصل کرتی رہی ہے اور بقول ان کے یزداں کی بلندیوں کو انسان چھو کر ہی دم لے گا۔

اِس نفسیاتی توحید کے ساتھ ساتھ فلسفی یہ نکتۂ نگاہ بھی پیش کرتا ہے کہ خدا کے وجود سے بھی دَر حقیقت اِنکار نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل خدا کسی مادّی شکل کا نام نہیں، وہ صِفت کا نام ہے۔ وہ طاقت اور مادّہ دونوں کی شکل میں ظاہر ہے۔ اِس صفت کو نہ ہی پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ ضایع کیا جا سکتا ہے۔ مخصوص سائینسی اِصطلاح میں اِسے صِفت کی بقائے دوام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ اشیا کی نمودِ ظاہری کی محرّک ہے۔ اِسی صِفت کی ایک شکل اگر طاقت ہے تو دوسرا رُوپ یا مادّہ ہے۔ طاقت کی معراج یہ ہے کہ وہ مادّہ کی شکل میں مظہر ہو۔ اور مادّہ کی اِنتہا یہ ہے کہ وہ طاقت کا رُوپ دھار لے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے مُنسلک ہیں اور رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ

مادہ کے بغیر طاقت کا کوئی وجود نہیں یا یوں کہیئے کہ مادہ کے ارتقا میں طاقت کی قوتیں جلوہ افروز ہیں۔ اسی ارتقا کا ایک مظہر آفرینش کا وجود ہے۔ آفرینش مادہ کے ارتقا کی ایک شکل ہے۔

آفرینش عناصر کے ظہور و ترتیب کا نتیجہ ہی سہی، لیکن عناصر میں ظہور و ترتیب کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ چند ایسے بُنیادی سوالات ہیں، جن کے متعلق ہماری لاعلمیت مُسلّم ہے اور جن کے سامنے بادلِ ناخواستہ ابھی ہمیں اپنا سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ البتہ آفرینش کے وجود میں آنے کے بعد سے اِس کے طنطنہ و طمطراق اِس کی شوکت و تجمّل، اس کی سیمابی فطرت، اِس کا اِضطراب کہ ماحول پہ چھا جانے کی سعی یا دوسری صورت میں اپنے آپ کو ماحول کے مطابق بنانے کی کوشش ارتقا کا وہ زینہ ہے جس کے مختلف مدارج طے کر کے آفرینش کے اوّلین غولوں جیسے حشرات الارض ــــــ استخوانِ شکستہ، دشت و صحرا کے قوی ہیکل اور دیو قامت حیوانات، خوبصورت اور خوشنما پرندوں اور فطرت کے سب سے زیادہ عظیم شاہکار، اشرف المخلوقات اور سرتاج عالم یعنی حضرتِ انساں کی شکل میں ظاہر ہوا۔

زندگی نے یہ سفر ایک ہی جست میں طے نہیں کیا، اس کے لیئے وہ وقت کی دشوار گزار اور پُر خطر راہوں سے گزری ہے۔ دراصل زندگی کی کوئی منزل نہیں۔ وہ ہمیشہ سے سفر میں رہی ہے اور اپنی بقا کے لیئے اُسے ہمیشہ سفر میں رہنا ہوگا۔ زندگی کا ارتقا اِسی سے قایم ہے کہ وہ، خُوب سے خُوب تر اور مکمل سے مکمل تر ہوتی رہے۔ زندگی باقاعدہ مُتواتر

اور مسلسل ترقی کر رہی ہے تاکہ اپنے آپ میں اور اپنے ماحول میں زیادہ سے زیادہ مماثلت قایم کرے۔ اِس کے لیئے اُسے اپنے داخلی ماحول یا سماج کو اپنے خارجی ماحول سے مطابق کرنا پڑتا ہے۔ ماحول مسلسل تجربہ کرتا ہے اور وہ تجربات جن کے نتائج اس کے موافق ہوں، اُنھیں وہ قبول کرتا ہے اور ناموافق تجربات سے گُریز کرتا ہے۔ اگر اس زاویئے سے وہ ذرا بھی اِنحراف کرے تو وقت کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ ماحول مَلیا میٹ ہو جائے۔ ایسی صورت میں ماحول کے لیئے صرف دو راستے رہتے ہیں:۔

۱۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے آپ کو خود ترتیب دے، اُن عناصر کو جو تغیّر سے اعتکاف یا گوشہ نشینی اختیار کرنا چاہتے ہیں، حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے ہٹا دے۔ اِس حالت میں جو تغیّر رُونما ہوتا ہے اُسے ہم انقلاب کہتے ہیں۔

۲۔ دوم یہ کہ ماحول اُن عناصر کو جنہیں ہم رجعت پسند کہتے ہیں ازسرِنو اپنی تشکیل کا موقع دے تاکہ وہ خارجی ماحول کے عین مطابق ہو سکیں۔ ایسی صُورت میں بھی تغیّر ضرور رُونما ہوتا ہے۔ لیکن ہم اسے محسوس نہیں کرتے۔

دونوں طرح کے انقلابات کا ماحصل ایک ہے، لیکن دونوں کا عمل جُداگانہ ہے۔ پہلی حالت میں تبدیلی اچانک رُونما ہوتی ہے۔ ہمیں ہمارے خواب گراں سے جھنجوڑ دیتی ہے۔ وہ جو اس کے لیئے تیار نہیں ہوتے ہیں، اُنھیں آسیائے گردشِ ایّام پیس کر رکھ دیتی ہے۔

دوسری صورت میں حالات کا تغیّر اتنا تیز گام نہیں ہوتا۔ تبدیلی جو رونما ہوتی ہے وہ ہمیں دھکے دیتی ہے، جھنجھوڑتی نہیں۔ ہم جاگتے ہیں، لیکن محسوس نہیں کرتے کہ کسی نے ہمیں جگایا ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا جاگنا عین فطری تھا۔ زندگی اب بھی گرمِ سفر ہے۔ وہ اب بھی سامانِ سفر ٹھیک کرنے کی فکر میں ہے۔ وقت کے ساز پر زندگی اب بھی محوِ رقص ہے، نہ جانے یہ عمل کب سے جاری ہے اور کب تک جاری رہے گا۔

انسان سے پہلے جب بھی کسی ذی رُوح شئے کو اس تغیّر کا شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر سامنا کرنا پڑا ہے تو اُس نے صرف ایک ہی راستہ اختیار کیا وہ یہ کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنی تشکیل کی۔ ایسا کرنے میں اُس کی بقا تھی اور اُس نے ایسا نہ کیا تو وقت نے اُسے مٹا دیا۔

اِنسان پر جب بھی اِس آزمائش کا وقت گزرا ہے، اِنسان کی ہمیشہ سے یہ سعی رہی ہے کہ وہ ماحول پہ چھا جائے۔ یہی تفاوت کی لکیر ہے۔ یہی باقیوں سے اُسے ممیز کرتی ہے۔ ماحول پر چھا جانے کی خواہش، ماحول کی تسخیر ہمیشہ سے اِنسان کا اوّلین مقصد رہا ہے۔

سائنس، مذہب یا دیگر عُلوم، ادبِ عالیہ یا فنونِ لطیفہ اِسی کا عطیہ ہیں۔ یہ جذبہ بہت ہی مقدّس ہے۔ شروع شروع میں جب اِنسان وجود میں آیا تو اُس کی تمام تر کاوِش، اُس کی تمام تر قوت، اُس کی تمام تر صلاحیت اس بات پر مرکوز ہو گی کہ وہ کیوں کر ماحول کے تقاضوں کو پُورا کرے۔ کس طرح سے وہ اپنے آپ کو ماحول کے عین مطابق بنائے۔

لیکن جس وقت اُس نے رہنے کا ڈھنگ سیکھا، ماحول سے کسی قدر شناسی حاصل کی تو اقبال کی زبان میں اُس کی نگاہ تیز — دِل کے وجود کو چیرنے کی فکر کرنے لگی۔

حقایق کا تیشہ اُٹھا کر وقت کے سنگلاخ کوہِ گراں سے ایک سازگار ماحول کی آبجو نکال لینا اُس کا دلچسپ ترین شغلہ رہا ہوگا۔

پہلا زمانہ ماقبل تاریخ کا دور ہے، جس میں انسان نے ایک دوسرے کو سمجھنے کی سعی کی۔ لیکن دوسرا وہ جلیل القدر، عظیم الشان، تابناک دَور ہے، جس میں انسان نے اپنے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مذہب و علوم، فنونِ لطیفہ اور ادبِ عالیہ نے اِسی دَور میں جَنم لیا ہے۔

اس کی شروع کی فتوحات پہیئے یا آگ پر قابو پالینا، یا غاروں میں مُبہم سے نقوش بنانا، آج ہماری نظروں میں اِن کی اہمیت کتنی بے معنی، مُہمل، لغو اور حقیر ہو، لیکن اُس زمانے میں اُس کی اہمیت کس قدر ہوگی، اس کا اندازہ ہم سبک نظری سے نہیں کر سکتے۔ اگر ہم ذرا اُس ماحول کا تصوّر کریں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ پہیئہ یا آگ یا غاروں کے اُن مبہم سے نقوش میں ایک پُورا دَور اور ایک پوری تہذیب دفن ہے۔!

اِنسانی تہذیب کے ارتقا کو سمجھنے کے لیئے ہم اُن واقعات کو جو بظاہر غیر ضروری اور حقیر ہیں، نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ وہ سنگِ میل ہیں، جن کے بغیر ماضی تو ماضی، حال دور کنار، ہم اپنے مستقبل کے لیئے

بھی کوئی راہ متعین نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا کلچر اُن رسوم و روایات کو بھی اپنے دامن میں لیئے ہوئے ہے جو بظاہر کوئی معنیٰ نہیں رکھتے۔ اس کے باوجود ہماری زندگی، ہماری تہذیب و تمدّن کا بہت ہی اہم جزو ہیں۔ ہم ان ہی رسوم و روایات کو اپنا آبائی اور قومی ورثہ سمجھتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، ہم ان پر فخر کرتے ہیں۔ ہماری تہذیب، ہمارا تمدّن، ہمارا کلچر یہ سب ہمارے ماحول سے وابستہ رہے ہیں۔ یہی ہمیں پتہ دیتے ہیں کہ ماحول پہ چھا جانے کی سعی انسان کا اوّلین مقصد رہا ہے۔

شروع شروع میں جب انسان کو زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو اس کی فکر ان تشنۂ تکمیل تقاضوں کی تشنگی ہٹانے کے لیئے حقایق کے چشمۂ حیواں کی تلاش میں نکل پڑی۔ کوئی خضرِ خجستہ گام اس کا رہبر نہ تھا۔ کوششِ ناتمام اس کے آگے بڑھنے کی محرّک تھی۔ انسان نے ابھی اپنی منزلِ مقصود کو نہیں پایا ہے وہ اب بھی سرگرمِ سفر ہے۔ حقایق کو سمجھ لینا، حقایق کو پا لینا، حقایق کی تلاش، صدائے جرس بن کر آج بھی اسے پیش قدمی کا پیغام دیتی ہے۔ یہ پیش قدمی فرد کے لیئے ہی نہیں بلکہ عالمِ انسانیت کے لیئے دعوت ہے۔ کیوں کہ انسان ہر مشکل کا اجتماعی طور پر سامنا کرتا ہے۔ انسان اپنے ماحول میں یکسانیت پیدا کرتا آیا ہے اور اجتماعیت یکسانیت سے جنم لیتی ہے۔

ارتقا کے عمل اور ردِ عمل کے دوران جب ماحول تبدیل ہوتا گیا تو عام طور پر آفرینش کی بقا اسی میں تھی کہ وہ اپنی تشکیل ماحول کے مطابق کرے۔ لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے، جس وقت زندگی کا عظیم معجزہ "انسان" کی صورت میں جلوہ گر ہوا، تو اس کی کوشش یہی رہی کہ اپنے ماحول کی اپنے تقاضوں کے تحت صورت گری کرے۔ اِس جادہ پیمائی میں زبان کی نشوونما کے بعد اس کی پہلی منزل فنونِ لطیفہ کی ابتدا رہی۔ یہی وہ چیز ہے جس نے اِنسانی ماحول میں یکسانیت پیدا کرنے میں اُہم رول اُدا کیا ہے۔

انسان نے اِنفرادی تقاضوں کو اجتماعیت کی زنجیر میں جکڑ لیا ہے۔ انسانی فکر و ادراک کی نوک پلک نے مُنتشر خیالات کے قطراتِ اشک کو پُرو کر رشکِ لعلِ بدخشاں بنا دیا ہے۔ اضطرار کی تاریکیوں کو عزم و حوصلہ کے شمس و قمر کی تابانیاں عطا کی ہیں اور پھر اُوہام کے استخوانِ شکستہ کو حقایق طعامِ لذیذ سمجھ کر نوشِ جان کرتے رہے ہیں اور انسان کے اُفقِ تخیل پر صُبحِ درخشاں کی طرح یقینِ کامل نمودار ہوا ہے۔ حقایق پر یقین رکھ کر انسان نے زمانے کی تقدیر کو بدل دیا ہے۔ اِس کی خاطر کبھی اُسے شہیدِ کربلا بننا پڑا ہے اور منصور کی طرح کبھی دار و رَسن کی آزمایش سے گزرنا پڑا ہے اور کبھی سقراط کی طرح زہرِ ہلاہل کا جام مُنہ سے لگانا پڑا ہے۔ لیکن زہرِ ہلاہل کو اُس نے ہمیشہ زہرِ ہلاہل ہی کہا ہے، شکر قند کبھی نہیں کہا۔ سراب کو سراب کے نام سے ہی پکارا۔

تسنیم و کوثر کبھی نہ کہا۔ حق و باطل میں ہمیشہ اس نے امتیاز کیا ہے، اور یہی چیز مخلوقاتِ عالم میں انسان کو بلند مرتبت ثابت کرنے کی سب سے محکم دلیل ہے۔

چونکہ اِس محاکمہ میں ماسوائے ادبِ عالیہ اور فنونِ لطیفہ کے دیگر عُلوم و فلسفہ کا تذکرہ مطلوب نہیں، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انسان نے فنونِ لطیفہ یا ادبِ عالیہ کے ذریعہ اوّلین طور پر مذہب کا رُوپ دے کر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

یہ وہ چراغ ہے، جسے اُس نے ظلمت کے اُس طوفان میں خُونِ دِل اور جگر کا سوز دے کر روشن رکھا اور اس کی ٹمٹماتی لَو میں وہ اپنی راہ تلاش کرتا رہا ہے۔ یہ راہیں کتنی طویل ہیں، اِن میں کتنے پیچ و خم ہیں۔ دشتِ تجسّس کے نوکِ خار اس کی آمد کے مُنتظر ہیں اور سفر کٹھن ہے۔

آخرکار اِس سفر کا انجام کہاں ہوگا؟

اِس وقت کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ بقول علامہ اقبالؔ ؎

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دِل سے پُوچھ
جُوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

وقت کی اِن چٹانوں کا سینہ چیر کر اور مصائب کے سنگِ گراں کو پاش پاش کر کے اِنسانیت آج بھی منزلِ

مقصود کی جانب بڑھنے کے لیئے نئی اور آسان ترین راہیں تلاش کرنے میں مشغول ہے۔

○

بابِ دوم

فنونِ لطیفہ اور ادبِ عالیہ کی ابتدا اور اہمیت کا مطالعہ کرنے کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ افادیت کے لحاظ سے اِن دو کا مرتبہ کیا ہے۔ یہ کِس حد تک زندگی کی تنقید اور تفسیر ہیں۔ فنونِ لطیفہ اور ادبِ عالیہ کا ایامِ سَلف میں کِس قسم کا آفاقی کردار رہا ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فنونِ لطیفہ اور ادبِ عالیہ کا آفاقی کردار نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی زمانۂ قدیم میں اِن کا کوئی آفاقی کردار تھا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اقوامِ عالم میں اِفتراق ہے اور اپنی ضرورت اور موقعہ محل کے مطابق ادبِ عالیہ یا فنونِ لطیفہ کی تخلیق ہوتی ہے۔ اِس لیئے اِن سے کوئی

بین الاقوامی افاضہ ممکن نہیں ۔ یہ لوگ مادّیت اور معیشت کے افسوسناک مباحث میں اُلجھ کر فن کی طبقاتی تقسیم پر بہ ضد ہیں ۔ آج فن کو سرمایہ داری اور اشتراکی حصّوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے ۔ یہ لوگ اپنی زنبیل میں ژاژ لیئے پھرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ سبدِ گُل کی فیض بخشیاں اُنھیں ہی میسّر ہیں ۔ ان کی یہ خود فریبی ظُلمِ ناروا سے کچھ کم نہیں ۔ اس کے خلاف دانشورانِ عصرِ حاضر کو صدائے احتجاج بلند کرنا ہے ۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو یہ ایک ناقابلِ معافی اخلاقی سفاہت ہو گی ۔ مصلحتوں کی تحدیدِ خفی صاحبِ قلم کو مرعوب نہیں کر سکتی ۔ ہم نے مانا کہ قلم کار چھوئی مُوئی سے زیادہ حسّاس ہوتا ہے ۔ اس کی نازکیِ طبع کے لیئے ژولیدگی کو سُلجھانا ہم داماں کے صحرائے لق و دق میں سرو و سمن اور گلہائے رنگا رنگ کی تلاشِ بے سُود کے مُترادف ہے ۔ یہ کام مصلح ، ناصح ، فقیہہ اور بلند مغز فلسفی کا ہونا چاہیئے ۔ لیکن یہ لوگ اپنا فرض انجام نہ دیں تو آرٹسٹ نوکِ خار سے نبضِ رنگ و بُو کو چھُونے پر مجبُور ہے ۔ یہ شاعر خوش نگاہ یا ادیب دقیقہ رَس کے مذاقِ سلیم کے لیئے بہت بڑی بد ذوقی ہو گی ۔ لیکن غور تو کیجئے کہ واعظ کا رول اَدا کرنے پر آرٹسٹ مجبور ہے ۔ وہ اِس گھناؤنے زخم پر پھاہا نہیں رکھ سکتا ۔ آخر زخم جب ناسُور بن جاتا ہے ، اُس پر کیوں کر مرہم لگایا جا سکتا ہے ۔ اُسے تو کاٹ کر پھینک دیا جانا چاہیئے تاکہ زہریلے جراثیم جسم کے دوسرے حِصّوں میں ،

سرایت نہ کر جائیں۔ مریض کے لیئے عملِ جرّاحی کلفت کے کانٹوں کی سیج سے کچھ کم نہیں۔ لیکن چند لمحوں بعد یہی اُس کی راحت و شادمانی کا سامان بن جاتی ہے۔ جس چیز کو اُس نے تلخ تصوّر کیا تھا وہ نیتجہ میں دراصل شہد سے زیادہ شیریں تھا۔ اب وہ اپنے چارہ گر کا احسان مند ہو گا شاکی نہیں۔ ادبِ عالیہ یا فنونِ لطیفہ کی آفاقیت کی مخالفت کرنے والے اصحاب اپنی شکست کا اعتراف کرلیں گے۔ یہ چند لوگ جو فن کی طبقاتی تقسیم کرنا چاہتے ہیں، فن کی پاکیزگی، عِفّت، تقدیس اور لطافت بلکہ اَدا کی ہزار شیوہ نیرنگیوں کو اپنی کم نظری کے باعث مُستحکم حُدود میں بلکہ صلابت و سلاسل میں جکڑ کر رکھ دینا چاہتے ہیں، وہ پھُول سے اُس کی خوشبُو کی لطافت، رات سے اُس کی سیاہی کی عظمت اور صُبح سے اُس کی درخشندگی کا حُسن چھین لینا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا گُلہائے اَحمریں کی آتشِ خنداں تُنک مایہ گریۂ شبنم کے چند بے بُود قطروں سے کہیں بجھ سکتی ہے؟

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، دراصل آج کا تخلیق کار اپنے فرائض کو بھُولتا جارہا ہے۔ وہ ادبیاتِ عالیہ یا فنونِ لطیفہ کے آفاقی کردار سے پُوری طرح آشنا نہیں۔ نگاہِ نکتہ رس اچھی طرح جانتی ہے کہ فنونِ لطیفہ و ادبِ عالیہ کی فطرت آفاقی ہے۔ ہر قوم کے کلاسیکی اَدب سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اُس مہدئ برحق کو عالمِ تصوّر میں دیکھیئے جو میدانِ کارزار میں

شش جہت پر جب نگاہ دوڑاتا تو اپنے آپ کو بالکل تنہا پاتا۔ نہ کوئی ساتھی تھا اور نہ کوئی دوست۔ لیکن پھر فکرِ رسا اُمید کے دامن گیر ہوتی۔ اسی اُمید کی سُبک رَو ہواؤں کے سہارے زندگی کی ناؤ چھوڑ دی۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ اس دریائے پُر آشوب میں کس کس جگہ بھنور ہیں، خاموشیٔ امواج میں کتنے طوفان ہیں۔ کبھی پھولوں کا بستر میسر ہے، کبھی ایسا وقت بھی آئے گا کہ کانٹوں کی سیج پر سونا پڑے گا۔ کبھی کلیوں کا تبسّم خوش آمدید کہہ رہا ہے، کبھی آگ کے دہکتے ہوئے انگارے استقبال کرنے کے لیئے ہوں گے۔ یاس و مایوسی اور بیم و رجا کا عالم تھا جس میں وہ زندگی بسر کر رہا تھا۔

یہ قنوطیت اس کے تخیلِ رنگیں کی شعبدہ بازی نہ تھی۔ یہ وقت کی صدائے بازگشت تھی جو اس کے کانوں میں خطرے کا الارم بن کر گونجتی تھی۔ وہ تحت الشعور کے آئینہ میں آئندہ کے واقعات کا عکس دیکھتا تھا۔ اُسے حالات کا مقابلہ کرنا تھا اور حالات موافق نہ تھے۔ شروع شروع کے اِنسان اور بن مانس میں فرق کی گنجایش بہت زیادہ نہ تھی۔ شروع کے انسان کا اہم ترین مُدعا بقائے نسل اور اپنی بقا تھا۔

اُس کے لیئے راتیں حسین نہ تھیں، آسمان پر کسی دوشیزہ کی بکھری ہوئی زلفوں کی طرح پھیلے ہوئے لاتعداد تاروں کے جال اُس کے لیئے کوئی مفہوم نہ رکھتے تھے۔

چاند کی نرم و نازک کرنیں عذارِ محبوب سے کوئی مشابہت نہ رکھتی

تھیں۔ بلکہ وہ جنگل کے وحشی درندوں کے لیئے مشعل نمائی کا کام کرتیں، جو کسی وقت بھی اُس کے تنگ و تاریک غار کے غدفے پھاند کر اُسے لُقمۂ اجل بنا سکتے تھے اور اگر اُن سے نجات ملتی تو نمودِ صبح دیکھنا نصیب ہوتی۔ پھر بھی جنگلی جانوروں اور وحشی درندوں کے خوف سے باہر نکلنا آسان نہ تھا۔ مہرِ نیم روز کی رُوح فرسا اور آتشیں شعاعوں میں جبکہ جنگل کے تمام جانور اپنے کچھاروں میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے' یہ بَن مانس نُما انسان تلاشِ روزگار میں جنگل کی خاک چھانکتا۔ اُسے کچھ بھی سوچنے کی فرصت نہ تھی۔ بقول ابو الکلام آزاد "یہ سچ ہے کہ خدا کی ہستی کا عقیدہ انسان کے ایک فطری احتیاج کا نتیجہ ہے"۔ لیکن اُس وقت اس نے اِس عظیم فِطری احتیاج کو بھی محسوس نہ کیا تھا۔ ایسے ہولناک ماحول میں یہ فِطری احتیاج جنم بھی نہیں لے سکتا تھا، جہاں غمِ روزگار کے صحرائے پُرخار ہوں۔ جہاں مصائب کے آتش فشاں شعلہ زَنی کرتے ہوں' جہاں پریشانیوں کے طوفانوں کی ہولناکیاں مُبازرت طلب ہوں، جہاں زمانے کی زہریلی اور مسموم ہوائیں زندگی کی نوخیز کلیوں سے اٹکھیلیاں کرتی اُنہیں مَسل دینا چاہتی ہوں۔

ذرا سوچیئے کہ ایک بے سہارا بن مانس فطرت کی تمام مخالف طاقتوں کی یلغار کی زد میں ہے، سنگدل فِطرت اسے گھائل کر دینے پر آمادہ ہے، وہ فطرت کی ہولناکیوں کا شکار ہے، زخم ہی زخم ہیں' جن سے لاچاری اور مجبُوری پیپ اور خُون بَن کر رِس رہی ہے۔ تریاق

کے دو گھونٹ میسّر نہیں۔ پھر کیوں کر وہ اِن زہر ناکیوں کے بیچ جی سکتا تھا؟ اِن ناسُوروں کے لیئے کہاں سے گُلِ شاموس لا سکتا تھا؟

ہر وقت ایک نیا سوال، ہر وقت ایک نیا مُعمّہ، کِس کو وَا کرے، کِس کو سُلجھائے ـــــ سب کے سب دقیق خمِ کاکُل کی طرح، یا جیسے تار ہائے عنکبُوت کے لاتعداد پیچ در پیچ جال ـــــ ہر نئے خم کے سُلجھانے پر لاکھوں نئے پیچ و خم سامنے۔ ایک عقدہ وَا کیا تو سینکڑوں نئے تقاضوں نے جنم لیا۔

اِن حالات میں انسانیت فطرت کی قہرمانی قوتوں سے برسرِپیکار تھی۔ پلّہ فطرت کا بھاری تھا۔ انسانیت ہزیمت کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ اسے صفحۂ ہستی سے مِٹانے کے لیئے لاکھوں جتن کیئے گئے۔ کیا کیا سازشیں ہوئیں۔ خود اس کے مَن میں استخفافِ شکست خوردگی کی بَدلیاں اُٹھیں، طوفان آئے انسانیت کو فنا کرنے کے لیئے فطرت کی قہرمانی قوتوں کے کوندے لپکے، اِنسانیت کو فنا کرنے کے لیئے پَے دَر پَے حملے ہوئے۔ اِنسانیت بے چاری کِس کِس سے عہدہ بَرا ہوتی؟ کہاں کہاں پناہ لیتی؟ کون تھا جو اِسے آسرا دیتا؟ اِن طوفانوں کی یورِش میں، اِن طغیانیوں کی یلغار میں، ان مصائب کی چمکتی ہوئی بجلیوں میں، اِن لپکتے ہوئے کوندوں میں ـــــ

ایک صرف ایک اُمید کا دیا تھا جو ٹمٹما رہا تھا یا یُوں کہیئے کہ عزمِ جواں کا جھلملاتا ہوا چراغ تھا، جسے اِنسانیت نے یقین کا خُون دیکر

زندہ رکھا اور جس کی مدّھم مدّھم روشنی میں وہ اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

اِس ماحول میں اِنسان کو یہ فرصت کہاں تھی کہ وہ یہ سوچتا کہ، منظرِ فطرت کی ان تمام کارکردگیوں کے پیچھے کونسی قوّت کارفرما ہے؟ انجم ہائے فلک کو درخشانی کس نے دی ہے؟ کیوں دی ہے؟ کیسے دی ہے؟ ماہِ سیمیں کی تابانی کس کے دَم سے ہے؟ آفتاب کی شعاعیں رُوح فرسا اور شعلہ بار کیوں ہیں؟ وہ تو صرف اِتنا جانتا تھا کہ دریائے نیل میں طغیانی آتی ہے۔ کیوں آتی ہے؟ اُسے معلوم نہ تھا۔ کیونکہ یہ سوچنے کی اُسے فرصت نہ تھی۔ یہ طغیانی جب آتی تو اُس کے لہلہاتے کھیتوں کو ویرانہ بنا کر رکھ دیتی۔ اُس کے جھونپڑوں کو خس وخاشاک کی طرح بہالے جاتی۔ چند موجوں کی بُوالہوسی اس کی محنت کا معاوضہ تھا۔ اُس کے خُون پسینے سے سینچے ہوئے دھان کے کھیت دریائے نیل کی پُرشور موجوں کے قدموں میں رَوندے جاتے۔ یہ بے پناہ دھارا یہ اُمڈتا ہوا سیلاب، یہ بپھری ہوئی موجیں، یہ مُضطرب طوفان، اُسکی تدبیروں کے دائرے میں گرفتار ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اِس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ اُس نے تجربے سے سیکھا تھا کہ خود اُس کی قوم میں طاقتور نے مظلوم کو دبوچا تھا۔ کسی کی بےچارگی کی لاش پہ اپنی مُسرّت کے محل تعمیر کیے تھے۔ کسی کے آنسوؤں سے اپنے قہقہوں کے زیر وبم پیدا کیے تھے۔

اِس لیئے اُسے احساس ہو گیا تھا کہ نیل کا دریا عظیم ہے اور وہ مظلوم ہے۔ نیل کا دریا طاقت ور ہے اور وہ کمزور ہے۔ اِس طاقت ور اور عظیم درندے کو خوش کرنا ہوگا۔ اس کی عظمت کے راگ گا کر۔ اِس کی داستانِ ظلم کو تسامحِ عندیہ (Enphemism) کی شعبدہ بازی سے اِستحسانِ فطرت کے رُوپ میں ظاہر کر کے اسکی قہرمانی قوتوں کو فریبِ تخیّل کی سحر کاری کے ذریعہ نعمتِ خداداد جتلا کر، اور اگر اس کے باوجود بھی اس قہرماں کا جلال بدستور قایم رہا تو نوجوان، حسین، اَلھڑ اور معصوم دوشیزاؤں کو جن کے لبوں پر مُسکراہٹوں کے کنول کھِلے ہوتے تھے۔ جن کی آنکھوں میں ستاروں کی چمک ہوتی، جن کے اَبروخمِ محراب سے ہزار گونہ نظر کش تھے۔ جن کی بَل کھاتی نازنیں کمر میں کوندوں کی لپک تھی۔ پائے نازک کی تال پر کلیاں چٹک اُٹھتی تھیں، جن کی سُبک خرام چال دِل کی دھڑکن کی آہٹ سے بھی زیادہ —— نیل کے کھولتے ہوئے لاوے، اُس اُبلتے ہوئے سمندر، اُس مضطرب طوفان کی نذر انہیں کیا جاتا! آن کی آن میں بَل کھاتی ہوئی وحشی موجیں کسی مُنہ کھولے ہوئے اژدہے کی طرح اُنہیں نگل لیتیں۔

کتنی بار ساحل سے ماں کی ماتا نے یہ تماشا دیکھا ہوگا؟!
اپنی کُوکھ سے اُگلے ہوئے کوہِ نُور کو قہر و غضب کے وحشی دیوتا کی بھینٹ چڑھتے دیکھا۔ دُھندلکوں میں کسی کے چمکتے ہوئے مینارۂ نور کی طرح خلا میں گھومتے ہوئے کسی شہابِ ثاقب کی طرح، ٹمٹماتے ہوئے ——

ستارہ سحری کی طرح جن کی روشنی اور تابندگی چند لمحوں کے لیئے نگاہ کو خیرہ کرتی ہے۔ یہ حسینائیں، یہ دوشیزائیں، یہ حسنِ معصوم، یہ کلیاں، جن کے منہ ابھی بند تھے، چند لمحوں کے لیئے سطحِ آب پر موجوں کے تھپیڑے کھاتیں، اُن کی کف در دہان چیخیں، ان کے خروشاں نالے، ان کی آہیں، کنارِ ساحل پر کھڑی ماتا کی بے بسی پر طنز کا ایک گہرا گھاؤ لگاتیں اور آناً فاناً میں موجوں کے ارتعاش میں گم ہو کر رہ جاتیں! ماں کی ماتا کا اِس سے سخت اور گھناؤنا، اِس سے کڑا اور وحشیانہ، اِس سے مہیب اور قابلِ رحم اِمتحان کیا ہو سکتا ہے؟ کیا انسان کی وَاہمہ سے بھی عظیم آذر کو فطرت نے جنم دیا ہے؟

دراصل انسان فطرت کا عظیم ترین شاہکار ہے۔ اور اِنسان کا عظیم ترین شاہکار اُس کا وَاہمہ ہے جو بعد میں منطق اور استدلال کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جس نے فنا کے اجزا سے جل پریوں اور دیوتاؤں کی تخلیق کی، ان کی تشکیل کی، ان کے وجود کو منوایا۔

گورکی کے الفاظ میں:

"انسان نے پہلے اپنے دیوتا تراشے اور پھر ان کے عین مطابق افسانوی ہیرو تراشے جو عوام کی مجموعی صفات کا پیکر ہوتے ہیں۔"

دوسرا مفکر بھی شیوۂ بُت پرستی کو شیوۂ انسانیت قرار دیتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ قوتِ متخیلہ فطرت کا سب سے اہم معجزہ اور انسان کی عظمت کا اشاریہ ہے۔ واہمہ تخیل کی غیر منظم شکل ہے، جو قوتِ متخیلہ سے قوتِ استدلال کو نفی کرنے کے بعد باقی رہتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں واہمہ کسی چیز کے وجود کو بغیر استدلال تسلیم کرنے کا نام ہے۔ اس بات کو مانتے ہوئے کہ انسانی شعور کا ارتقا ہوا ہے۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ واہمہ انسانی شعور کے ارتقا کی پہلی منزل ہے۔

یہ واہمہ جس کی بیداد کی داستان، جس کے ظلم کی کہانی وقت کے خونچکاں قلم سے تاریخ کے اَبدی اَوراق پر رقم ہے، اِسی کو تیشہ بنا کر اُولوالعزم اِنسانیت نے فطرت کی پُر اسرار قوتوں کی بیخ کُنی کی ہے۔ انسان نے دشتِ فطرت کے ناسازگار ماحول کے کوہ گراں کو کاٹ کر ایک سازگار فضا کی جوئے شیر نکالی اور صحرائے تجسس کو حقایق کے لالہ و گُل کی رنگینی سے رشکِ چمن بنا دیا۔

انسان نے پہلے دریائے نیل کو واہمہ کے آئینے میں طاقتور، اور جابر دیکھا۔ پھر وہ اس طاقت سے محبت کرنے لگا۔ انسان نے دریائے نیل میں جھانک کر اپنی خواہشات کا عکس دیکھا۔ برسوں یہ سلسلہ جاری رہا ہوگا۔ لیکن ایک دن خواہشات کے آتش فشاں نے پھٹ کر جذبات کا لاوا اُگلنا شروع کر دیا۔ انسان نے خود دریائے نیل جیسا طاقتور بننا چاہا اور اس آدرش کی صفات کی پرستش شروع کر دی۔

اِس طرح دُنیا کے سب سے قدیم ادبِ عالیہ یعنی مذہب کا دانستہ طور پر آغاز ہوا۔ یہ ادبِ عالیہ اُس وقت کی اِنسانی زندگی کی جدوجہد کی مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔ منطق اور استدلال کے سرچشمے کی تلاش بھی یہیں کی جا سکتی ہے۔ یہ اظہارِ خیال کا پہلا طریقہ تھا جو انسانیت نے سیکھا اور اظہارِ خیال نے انسانیت کو اسی اجتماعیت کا درس دیا اور اِس درسِ حیات کو ایک نیا آفاقی سماج قایم کرنے کے سِلسلے میں آج ہم پھر دُہرا رہے ہیں۔

○

باب سوم

اگلی بحث سے ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دُنیا کے سب سے قدیم ادبی شہ پارے اقوامِ عالم کے مذہبی صحائف ہیں۔ یہ مذاہب واہمہ کا نتیجہ ہی سہی، لیکن ان کا سماجی افادیت سے بڑا گہرا رشتہ ہے۔ دراصل یہ قدیم مذاہب سماجی افادیت کا نتیجہ تھے۔ ان کا اِبتدا میں ماورائیت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ زمانۂ قدیم کے فلسفی نے دانستہ یا نادانستہ خدا کا کوئی ماورائی تصور قایم نہیں کیا تھا۔ فطرت کی قہرمانی قوتوں کے سامنے اپنے آپ کو بے بس جان کر انھیں دیوتا اور اَوتار بنا ڈالا۔ یہ تصوّر اس کے تخیّلِ رنگیں کی شعبدہ بازی نہ تھی۔ جب کہ آسمان پر سے ماہِ درخشاں نُور کی بارِش برساتا ہے، چاند کی تابانی کو اور درخشاں

کرنے کے لیئے کہکشاں لاتعداد انجم ہائے فلک سے روشن ہو جاتا ہے اور ایوانِ شب سُبک سیر ہواؤں کے قہقہوں سے گُونج اُٹھتا ہے یا کبھی کبھی کوئی لکۂ ابرِ رَواں چاند کے نرم و نازک سیمیں عذار چُوم لیتا ہے۔ آج کا فلسفی گوشۂ تنہائی میں یہ سوچ سکتا ہے کہ 'خدا' کی کیا حقیقت ہے۔ لیکن زمانۂ قدیم کے مردِ مجاہد کے سامنے صرف بقا کا مسئلہ تھا' اور ہر چیز کی قیمت صرف افادیت کے سکوں میں لگائی جاتی تھی۔ نیکی اور بدی کا تصوّر، تخریب اور تعمیر کا فلسفہ سماجی افادیت کا نتیجہ تھے۔ بقول کیسے: "تمام گناہ بدصورتی ہے اور تمام نیکی حُسن ہے"۔ اور حُسن کا یہ تصوّر دُنیا کے تمام مذاہب میں مُشترک ہے۔ حتیٰ کہ وہ مذاہب جنہیں بظاہر مجموعۂ خرافات اور زیادہ عمیق طور پر مُلاحظہ کرنے کے بعد رسم و رواج کہا جا سکتا ہے، صرف سماجی افادیت کے آئینہ دار ہیں۔ دوسرے الفاظ میں انسانی بقا کا تقاضا سماجی افادیت ہے' اور سماجی افادیت کا نتیجہ اِنسانی وَاہمہ کی صُورت میں جُلوہ گر ہوا ہے اور اس واہمہ کا بتدریج ارتقا ہوا ہے۔ تخیل اسی واہمہ کی اعلیٰ ترین شکل ہے یا دوسرے الفاظ میں سماجی افادیت کا نتیجہ انسانی واہمہ ہے اور قوتِ متخیلہ سماجی افادیت کا تقاضہ ہے۔ واہمہ اور قوت متخیلہ کے آپس کے تعلق کو سمجھنے کے لیئے انسانیت کی تاریخ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ عہدِ ماضی کے اِنسان نے

دریائے نیل کے سامنے اپنے آپ کو بے بس تصوّر کیا تھا اور جب اُس نے دیوتائے نیل کی عظمت کے راز کو سمجھنے کی کوشش کی تو اُس کی اپنی خواہشات کا وہ طوفان اُسے خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے، وہ خود اُس دیوتا جیسا جلیل القدر اور عظیم المرتبت بننا چاہتا ہے۔ وہ اِس دیوتا کے وجود میں اُن تمام صفات کو یکجا کر دیتا ہے، جن کی طلب خود اُس کے دِل میں کسی زیرِ سنگ کلی کی طرح چٹکتی اور اِس طرح جب قوتِ متخیلہ میں ادراک کے عنصر کے بدلے خواہش نے جگہ لی۔ نتیجہ وَاہمہ ہوا۔ یہ انسانی شعور کے ارتقا کے مختلف مَدارج تھے۔ قوتِ متخیلہ کی مَدد سے انسان نے اِس خواہش کو حقیقت بنانے کی سعی کی اور نتیجہ ارتقا ہوا، جذبات کا ارتقا، ذوقِ جمال کا ارتقا، برسوں یا یہ کہئیے کہ صدیوں کی تخم ریزی کے بعد گلاب یا نرگس یا سُنبل یا لالہ کے پھُول سے انسانی ذوقِ جمال نے جِلا حاصل کی ہوگی، اور پھر اِسی جذبے کے تحت صحراؤں کو لالہ زار بنانے کا عَزم پیدا ہوا اور پھر شاعر چیخ اُٹھا ؎

ہے صحرا اب بھی صحرا گر خونِ پا کا فیض

سیراب چند خارِ مُغیلاں ہوئے تو ہیں

بذاتِ خود فنونِ لطیفہ ہو یا ادبیاتِ عالیہ، مُدعا دونوں کا یہی رہا ہے، اور ہر آرٹسٹ اور مصنف کا خواہ وہ اَوتار یا پیغمبر یا فلسفی یا شاعر کا لبادہ اوڑھے ہوئے آیا، یہی منشا تھا کہ وہ اِس آدرش کو اپنائے۔

یہ جذبہ ایک عالمگیر جذبہ ہے جو آفاقیت کے اُصولوں پر مبنی ہے اور ہر اِف نی سینہ میں اس کا مَنبع تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے وہ "ادب" جو اِن بُنیادی اُصولوں کا قائل نہیں کبھی ادبِ عالی کا درجہ حاصل کر نہیں سکتا۔ وہ اَدب جو آفاقیت کو تسلیم نہیں کرتا ادبِ عالی کہلانے کا مستحق نہیں۔ اور ادبِ عالی خواہ وہ دُنیا کی کسی بھی زبان میں ہو، اپنے آفاقی کردار کو نُمایاں کیئے ہوئے رہا۔ یہ قوم و مُلک کی قید سے آزاد ہے، اور اِنسانیت کی میراث ہے۔ ادبِ عالیہ کی اوّلین شرط اُن جذبات کا اظہار ہے جو عالمگیر نوعیت کے ہیں۔ ادبِ عالیہ کا نصب العین اجتماعیت پیدا کرنا ہے، اس کی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔ انسان ہر مشکل کا اجتماعی طور پر سامنا کرتا ہے۔ انسان اپنے ماحول میں یکسانیت پیدا کرتا آیا ہے۔ اس کے برعکس دیگر "مخلوقاتِ عالم" کا کوئی دیدہ و دانستہ قایم کیا ہوا سَماج نہیں۔ اُن کے ماحول میں نیرنگی ہے یک رنگی نہیں، بے ترتیبی ہے سلیقہ نہیں. بے آہنگی ہے، ہم آہنگی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ارتقائے عمل اور ردِّ عمل کے دَوران جب ماحول تبدیل ہو گیا تو آفرینش کی بقا اسی میں تھی کہ وہ اپنی تشکیل ماحول کے مطابق کرے۔ لیکن جس وقت انسان وجود میں آیا تو اُس کی کوشش یہی رہی کہ اپنے ماحول کو تابع کرے۔ اس آزمایش میں اُس کی پہلی منزل زبان کی بازیافت

ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زبان کی نشو و نما نے زوال پذیر انسانیت کو لازوال بنا دیا۔ اس کے ذریعہ سے خیالات کا اظہار کیا، جو خود سوچا دوسرے کو بھی اُس پر سوچنے کا پیغام دیا اور اسی عمل سے اِنفرادیت اپنے قلب ماہیت یعنی اجتماعیت میں ظاہر ہوئی اور اِس طرح اِنسانی سماج وجود میں آیا۔ پس دوسرا نتیجہ جو ہم اَخذ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ خود انسان کا وجود اس کی زبان اور اُس کے کلچر کا وجود، ماحول کے تقاضوں کا نتیجہ تھا اور اس ماحول کو تابع کرنے کی خواہش بھی ماحول کا نتیجہ تھی۔ جیسا کہ باب دوم میں مُفصّل طور پر واضح کیا گیا ہے۔ پس یہ بات بھی صاف ظاہر ہے کہ اِس پس منظر میں اَدب کو سماج کا غلام سمجھنا بڑی سنگین غلط فہمی ہے۔ سماج کا مفاد، انسانی اظہارِ خیال پر مبنی ہے۔ ادبِ عالی اور فنونِ لطیفہ اظہارِ خیال کا سب سے موثر ذریعہ ہیں۔ پس ادبِ عالی کا تخلیق کار ایک تاریخ دان ہی نہیں جو صرف داستانِ زمانہ کو صفحۂ قرطاس پر نقش کر کے مقتدائے زمانہ ہونے کا دعویٰ کرے اور یہ جانے کہ اِنسانی عزم کی چند داستانوں کو تقویم پارینہ ہونے سے بچا کر اس نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے۔ بلکہ اِس تخلیق کار کا فن پارہ اِتنا آفاقی ہوتا ہے، جتنا کہ اُس کی اپنی شخصیت وقیع ہوتی ہے۔ اس کی انگلیاں نبضِ ہستی کو ٹٹولتی رہتی ہیں اور اگر آپ ثبوت چاہیں تو اجنتا اور ایلورا کی جیتی جاگتی تصویروں اور مُورتوں کو دیکھئے۔

تاج محل کو دیکھئے وہ کس طرح اس کی جوازیت فراہم کرتا ہے، شیکسپیئر کے نوکِ قلم کے بکھیرے ہوئے موتی آج بھی انسانی ذہن کو چکا چوند کرتے ہیں۔ وہ آج بھی اتنے ہی درخشاں ہیں جتنا کہ خود انہیں اپنے خالق نے دیکھا تھا۔ غور کیجئے کہ کیا گوئٹے کی شاعری ہمالہ کی چوٹیوں کی طرح وہ جلال لیئے ہوئے نہیں ہے جو ہمارے دل و دماغ کو مرعوب کیئے بغیر نہیں رہتا؟ کیا غالب نے قطرہ میں دجلہ دیکھنے کی تاکید ہمیں نہیں کی؟ کیا عقل افلاطونی دو ہزار سال کے دبیز پردوں میں سے جھانک کر جب بھی ہمیں اپنا جلوہ دکھاتی ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ افلاطون کا صحیح مقام آج بیسویں صدی میں بھی تعین کیا جا سکتا ہے؟ اور بالکل اس طرح ہر صدی میں علماؑ نے افلاطون کی نسبت یہی فتوٰی صادر کیا تھا۔

اِن حضرات کی فہرست بہت طویل ہے۔ یہ لوگ آفاقیت کے علمبردار ہیں۔ زندگی کی ظفریابی آفاقیت کو حاصل کر کے اپنی معراج حاصل کر لے گی۔ ہماری زندگی کا محور فتح و شکست ہی تو ہے۔ ہماری فتح یابی میں بھی ہماری ہزیمت کے نشان پنہاں ہیں اور ہماری شکست خوردگی پر بھی عزم ظفر مندی کے نقش ثبت ہیں۔ فرق صرف زاویوں کا ہے، جن سے ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ اَدبِ عالی کا خالق زندگی کا وہ رُخ پیش کرتا ہے جو کامیابی اور کامرانی کی تصویر ہماری نگاہوں میں لے آئے۔ منزلِ شوق کو دو قدم جان کر ہماری رفتار تیز ہو جاتی ہے۔

زمانے کے کڑے کوس طے کرنے والا راہی سہاروں کا متلاشی نہیں ہوتا اور ہو بھی کیوں ؟ کیا جب منزلیں پکارتی ہیں، راستے آسان نہیں ہوا کرتے ؟ زندہ رہنے کا عزم صمیم اور زندگی کو بہتر بنانے کا احساس اَدبِ عالی کے زرّیں مقاصد میں سے ہے۔ اِس جذبہ کا دوسرا نام ذوقِ جمال ہے۔ ہر وہ چیز جو انسانیت کے مفاد کو تقویت پہنچائے حسین ہے۔ جمالیات کا یہ تصور جس دوسرے نظریئے کو منظرِ عام پر لاتا ہے وہ فلسفۂ محبت ہے۔ اگر مفادِ انسانی ہی ایک محک ہے جس پر آفاقی اقدار کو پرکھا جا سکتا ہے تو محبّت ایک بہت ہی عظیم جذبہ کہلانے کی مُستحق ہے۔ کیونکہ محبت خود غرض نہیں، بے غرض ہوتی ہے اور انسان جب بے غرض ہو جائے تو اجتماعیت وجود میں آتی ہے۔ اجتماعیت، جسے انسانی برادری بھی کہا جا سکتا ہے۔ انسانی برادری کا یہ جذبہ ایک نہایت ہی اَرفع تر سطحِ نظر کے تحت یُوں اظہار پاتا ہے :-

"محبّت فاتحِ عالم!"

یا ایک نہایت ہی محدُود پیمانے پر شاعر کی زبان سے یُوں ادا ہوتا ہے :-

اِک لفظِ محبت کا اِتنا سا فسانہ ہے
سِمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

اگر آپ پھر بھی محبت کی انشراح چاہتے ہیں تو اِس جذبے کو اُس کے

متنوع رُوپ میں دیکھتے، کیسے یہ جذبہ ایک عورت کو بچہ جننے کی مشین کے طور پر نہیں بلکہ ایک لیلیٰ، ایک عذرا، ایک شیریں کے رُوپ میں پیش کرتا ہے اور بالکل اِس طرح آج بھی کتنے قیس نجد کے ویرانوں میں گریبان چاک ہیں۔ کتنے فرہاد ہیں جن کے تیشوں کی حرارت چٹانوں کو موم کی طرح پگھلا دیتی ہے۔ اِس زمانے میں تخت و تاج کو ٹھکرانے والے ایڈورڈ بھی موجود ہیں.

یہ چند مافوق البشر حضرات کے افسانے نہیں بلکہ یہ کہانی زمانہ ماقبل از تاریخ کے عاشقان سے لے کر عصرِ حاضر کے لاکھوں گمنام رومیو اور جیولٹ کی کہانی بھی ہے یہ ہر اُس شخص کی کہانی ہے جس نے دُنیا میں محبّت کی ہے اور دُنیا میں کون ایسا شخص ہے جس نے محبت نہیں کی کیونکہ جذبہ محبت ایک موجِ بے قرار ہے، جو ساحلِ زندگی سے ستیزہ کار ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ موج اور ساحل کا اختلاط نہ کبھی ہوا ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود بھی کتنا عجیب سا جنون ہے، کتنی عجیب شوریدگی کتنی فضول سی تمنّا ہے کہ سیلاب میں اُمڈے ہوئے دریا کی وحشی موجیں بار بار جاکر ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ خطوط اور دائرے بناتی ہوئی خوبصورت اور حسین جیسے مانیؔ و بہزاد کے نقش ہوں، دِل نشیں و دِلفریب!

لیکن یہ نقش پائیدار نہیں ہوتے۔ جیسے ہی طوفان تھم جاتا ہے سکوتِ موج کا مزار ہے اِن کی قسمت اور جھیل کی نیلگوں خفائے آب ہے ان بے نام سے افسانوں کا مدفن! لیکن موجِ تیز خرامیدہ

نے ساحل کے کناروں کو نوچا اور جیسا چاہا ویسا ہی تراشا! یہی زندگی ہے! یہی ہے زندگی اور محبت کا مقدس رشتہ!

زندگی کو بھی تراشنا ہے انسانیت نے اپنے مَنشا کے مطابق۔ ورنہ کون جانے، انسان اپنا اصلی مقام کھو بیٹھے، اور برسوں کے ارتقا کی مساعیِ جمیلہ مُشتِ غبار بن کر حالات کے طوفان میں بِکھر جائیں۔ ابھی تک اِس رجعتِ قہقہری کا آغاز نہیں ہوا ہے۔ لیکن حالات اس رجعت کے دَرپے ہیں۔ تباہ کُن بموں اور مُہلک آلات کی ایجاد ایک منحُوس شگون ہے۔ آئن اسٹائن کے الفاظ میں تیسری جنگِ عظیم کے بعد پھر زمانۂ ماقبل از تاریخ کا دَور شروع ہوگا۔ پس آج پھر فاتحِ عالم بننے کے لئے ہمیں محبت درکار ہے۔ محبت جو کبھی شیریں و فرہاد کی صورت میں جَلوہ گر ہوئی، محبت جو قبیلے کی شکل میں ہمارے سامنے آئی۔ محبت جو ہوریشس کی حُب الوطنی بَن کر جاگی تھی۔ یہ محبت جو ماں کی ممتا بَن کر ہمارے رُوح میں، ہمارے وجود میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

یہ محبّت جو یسوع کے سینے سے خون کی دھار بَن کر پھُوٹی تھی اور ہر فولادی نیشتر کو گل و لالہ کی رنگینی بخش دی۔ خُون کے ننھے ننھے قطرے ہر آہنی نوکِ خار پر اس طرح لَرز اُٹھے تھے، جیسے صُبح کے وقت گُلاب کی پنکھڑی پر شبنم کے قطرے شعشعۂ نُور کی آمد پر تھرتھرا اُٹھیں۔ اس شکستگی و کسمپرسی میں بھی سارے زخم

تبسّم آفریدہ تھے۔ درد کی ہر ٹھیس پر جو نشتر اُتر گئے، یسوع ہنس دیئے۔ یہ ہنسی حُسنِ تجلّی لیئے، یہ تبسّم عصمتِ لالہ لیئے، یہ مُسکراہٹ تقدیسِ گُل لیئے یا خود جلوۂ یزداں کا عکس لیئے، غم کے اندھیروں کو کالعدم کرتی ہوئی انسانیت کے لیئے صُبحِ اُمید بن گئی۔ یا یُوں کہیئے کہ ایک شاداب و دِلکش پھُول خزاں کی یلغار میں تھا۔ جو ہنستے ہنستے مُرجھا گیا اور خزاں کو رعنائیاں بخش دیں۔

باب چہارم

ابوابِ گزشتہ میں قاری نے دیکھا کہ کس طرح اُسلوبِ تمثیلی نے آفاقیت کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دیئے۔ معلوم ہوا کہ آفاقیت کا منشا صرف بقائے انسانی نہیں ہے بلکہ آفاقیت کا صحیح مقصد کائنات کو مسخر کرنا ہے اور انسان کو فطرت کا سرتاج بنانا ہے۔ یہ فطرت جس کی قوتِ استبداد پیغارہ بن کر انسانیت کو چیلنج دیتی رہی ہے اور بن مانس کو مجبور کر دیا کہ وہ فطرت کی صاف و شفاف آنکھوں میں جھانک کر اپنی بے بس اور مسخ صورت کو دیکھ لے۔ لیکن انسان نے نارسیس کے دیوتا کی طرح خود اپنے عکس سے محبت شروع کر دی اور تمام کائنات لامحدود انسانی تصور کی لپیٹ میں آ کر ایک نقطۂ بے مایہ

سے بھی زیادہ حقیر اور محدود ہو گئی۔ یہ عاشق کا تصور تھا۔ آج ہم جس نام سے بھی چاہیں اسے پکار لیں۔ ہم اس کو ادبِ عالی کہیں یا فنونِ لطیفہ، فلسفہ کہیں یا اسے سائنسی فتوحات میں شمار کریں، ہیں تو یہ سب عشق کی کرشمہ سازیاں۔ عشق جو انسان کو اپنے آپ سے ہوا ہے، وہ عشق جو انانیت کا سرچشمہ ہے۔ پس اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ ہر آفاقی قدر انانیت کی آئینہ دار ہے۔ انانیت کیا ہے؟ یہ غرور و گھمنڈ ہی نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ شدید احساسِ برتری کا نتیجہ ہے یا اسے انسانی فطانتِ طبعی کہیں جو ہر انسانی فعل کو ایک مقصد عطا کرتی ہے۔ یہ فطانت صرف انسان کا خاصہ نہیں۔ اگر غور سے دیکھئے، فطانت قدرت کی تمام معجز نمائیوں میں جلوہ گر ہے شش جہت فقط اژدہام رنگ و بو ہی نہیں بلکہ فطرت کی فطانت کا نگارخانہ ہے۔

نازکیٔ طبع کے لیے مسرت و راحت آفتاب نیم شبی کی مدقوق شعاع ہے۔ لیکن اگر اس کی ضیاپاشی دائمی ہو جائے تو شعشعہ بے مایہ و حقیر کی یخ بستہ و کہر آلود آگ تمام کائنات کو مفلوج بنا کر رکھ دے۔ اس کے برعکس قدرت کی فطانت ملاحظہ ہو، شباب موسم رنگ و صوت میں تابشِ خاور غرور و برنائی کے سبب نسیمِ صبح گاہی کی سنہری زلفیں شانہ کائنات پر بکھیرتا ہے اور تجلائے سحر کے حسنِ یگانہ سے بے خود ہو کر اس کے عنبریں اور مرمریں پیکر

کو آغوش میں لے لیتا ہے اور پھر بہارِ خوش نگاہ و صبیح کے دہنِ شیریں سے آبِ حیات نوشِ جان کرتا ہے۔ اِس منظرِ حسین کے سامنے شاعرِ حُسن پرست کا تخیل افلاس زدہ اور دریوزہ گر نظر آتا ہے۔ یقین نہ ہو تو شاعرِ فطرت وَرڈز وَرتھ سے استفسار کیجئے جو سالہا سال اَزلی حُسنِ بے پناہ کی جلوہ طرازیوں کے سامنے کشکولِ گدائی لیئے دستِ سوال دَراز کرتا رہا اور بالآخر اپنے فریبِ نظر پر خود صورتِ آئینہ حیران و ششدر رَہ گیا۔ ہمیں تسلیم کہ اس شاعر کا ہر شعر شفق کے رنگ میں رنگا ہوا اور زرّین کرنوں سے مرصع کار ہے۔ لیکن کیا یہ ہوش باختہ دیوانہ فرطِ انبساط کی شوخی میں آکر چند ساعقہ بردوش ساعتوں کی جادوگری سے مرعُوب ہو کر فِطرت پرستش پر آمادہ نہیں ہوگیا تھا؟ قانونِ فطرت کی محرک شورشِ پنہاں نے شاعر کی سادگی پر ضرور زہر خند کیا ہوگا!۔

آپ کبھی کہکشاں کی طرف نگاہ اُٹھائیے اور دیکھئے کہ کس طرح اجرام کی کششِ کے تحت شہابِ ثاقب فضائے لامحدُود کو جولانگاہ بنائے ہوئے اشہبِ فنا پر سوار سُبک خرامی سے منزلِ عدم کی جانب رَواں ہیں۔ آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ آیا اَبدی قوانین فِطرت کے استقرار کا نتیجہ ہیں، یا ان کا دراصل کوئی وجود نہیں اور اپنے گردوپیش کو سمجھنے کے لیئے انہیں ہماری قوتِ استنباط نے مخترع کیا ہے؟ اِستصواب کس سے کیا جائے؟

غور کیجئے۔ کیوں ضابطۂ لیل ونہار ہے؟ کیوں شاہدِ قمر پر ہی ہمارے شاعروں کی طرح مد و جزرِ بحرِ بے پایاں فریفتہ ہیں؟ کیوں نہایت کاوش جگری اور باقاعدگی کے ساتھ ہر روز مداد شب' صبحِ انوار کو پکارتی ہے؟ کیوں خلوتیانِ غیب نے کچھ اس سلیقہ کے ساتھ کالی گھٹاؤں کی نشو و نما کی کہ میخانے خمر آلود ہو گئے' اور پھر شاعرِ وہم و گمان کے لیئے کسی کی زلفِ تا بہ کمر ابرِ سیاہ کی سرمستیاں اور آدھ کھلی مست انکھڑیاں حریفِ مے ناب بن گئیں۔!

فطرت دراصل نظم و ضبط کا نام ہے۔ یہ صرف چند مظاہر پر ہی موقوف نہیں بلکہ تمام کائنات قانون وانضباط کے تابع ہے —— آئن سٹائن کے دیدۂ حکمت سے دیکھیے اور ذوقِ استفہام کو کہیئے کہ اقبالؔ سے پوچھ لے ؏

"لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں"

ہر ذرۂ ناچیز بذات خود ایک کائنات ہے۔ مجوّف نہیں جیسا کہ نگاہِ نارسیدہ کی گرہ کشائی سے متحقق ہے۔ برعکس اس کے ہر ذرّۂ ناچیز شانِ کبریائی کا دعوے دار ہے۔ ہر ذرّہ بے مایہ اپنے ثوابت و سیار لیئے ایک مکمل نظامِ شمسی ہے۔

یہ کہنا درست ہوگا کہ ہمارے عارفانِ جدید کا تفوض سقیم المحال (اور اس کا اعتراف نیوٹن نے خود کیا ہے) ثبوت بہم پہنچائے یا اس میں ناکام رہے کہ اِس آئینہ خانۂ نیست و بود میں

تخریب بھی دراصل تعمیر کا کوئی اُصول ہے، اور نیست کچھ بھی نہیں، ہمارا اپنا واہمہ ہے۔ کہسار شعلہ بار بلا وجہ اور بے معنی اپنی حدّتِ صنایع نہیں کرتے۔ وقتِ مقررہ سے اِذنِ مباح حاصل کر کے آتش فشانی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ طغیان زدہ بحر و دریا کو صرف اپنے مباہات کی نمایش مقصود نہیں۔ یہ بیچارے تو خود محصورینِ متابعت میں سے ہیں۔ محض اتھاہ ساگر کے تفنّنِ طبع کے لیئے جوار بھاٹا نہیں آتا۔ بَرق و رَعد کے خطرات، عالمِ نباتات کی ربوبیت لیئے ہوئے ہیں ناگہانی بھونچال کسی مخفی دار و گیر کی لغویت نہیں۔ یہ سایہ پروردہ اسباب اپنے ان آقاؤں کے احکام نہ بجا لائیں تو کیا کریں؟ دراصل ہستی قوانینِ فطرت کے پھندوں میں گرفتار ہے۔ طوفانوں کی جغرافیائی تقسیم اِن کے خصایص پر کی گئی ہے۔ ہَواؤں کے رُخ متعین ہیں۔ خزاں کی تاریکیوں سے ہی صُبحِ بہاراں درخشاں ہے۔ تخریب کے بغیر تعمیر ممکن نہیں۔ تعمیر کا کوئی تصوّر تک قایم نہیں کیا جا سکتا۔ تخریب دراصل تعمیر کا دوسرا نام ہے۔ اِس کائنات میں اگر تخریب کچھ بھی نہیں تو "فنا" بھی صرف لفاظی ہے۔ ہم مادّہ کو اگر فنا بھی کریں تو طاقت کو کون فنا کرے گا؟

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم مَادّہ کو بھی فَنا نہیں کر سکتے۔ صرف اُسکی ہیئت بَدل کر اُسے طاقت کا رُوپ دے سکتے ہیں۔ ہستی قانونِ دوام کے تابع ہے۔ اِس لیئے ہستی "طاقت یا مادّہ" کی شکل میں

موجود ہے اور نیستی کچھ بھی نہیں۔ موجوداتِ عالم اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ البتہ اگر کوئی نافہم ورق گردانیِ روز و شب میں کردگار کے قایم کردہ نظم و ضبط کے نکتہ ہائے دقیق اور رمز و کنایہ کو نہ سمجھ سکے اور پھر بھی محقق اور محشی ہونے کا دعویٰ کرے تو ہم اس کے سوا "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے" اور کیا کہیں؟ یعنی اگر کوئی غبی فحوائے قدرت کا مفہوم اور ارتقا نہ سمجھے اور نہایت وثوق کے ساتھ فتویٰ صادر کرے کہ کائنات کا ارتقا ہوا ہے تو بتائیے قصور کس کا ہے؟ ورنہ غور کیجئے کہ کیا موالیدِ ثلاثہ کی تقسیم اِس بات کی گواہی نہیں دیتی کہ فطرت ارتقا کو تسلیم نہیں کرتی۔ کیونکہ ارتقا کا مطلب قوانین کے پھندوں کو توڑ دینا ہے اور چونکہ ایسا ممکن نہیں، اس لیئے فطرت میں ممارست کی بھی گنجائش نہیں۔ دراصل فطرت نے تمام موجودات کو خود کفیل بنایا ہے، کائنات میں کہیں بھی سُقم نہیں، کوئی ناقص نہیں، کوئی مرجح نہیں، کوئی مخذول نہیں۔

ایک ذرّہ ناچیز سے لے کر بحرِ ذخار تک سب اپنی جگہ بہترین طور پر مکمل ہیں۔ اِس لیئے دوسرا نتیجہ جو ہم اخذ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اِس کائنات میں نہ تو ارتقا ہے اور نہ ہی انقلاب یا دوسرے الفاظ میں نہ تو کائنات میں تخریب ہے اور نہ تعمیر بلکہ صرف "ہستی" ہے۔ اِس کائنات کی کوئی اِبتدا نہیں اور نہ ہی اسکی

انتہا ہے۔ یہ کائنات ہمیشہ سے ایسی تھی اور ہمیشہ ایسی رہے گی۔
قوتِ مدرکہ اِس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتی کہ کائنات اوّلاً صرف طاقت تھی اور آہستہ آہستہ طاقت نے مادّہ کی شکل اختیار کی اور اِس طرح مادّہ آفرینش اور بالآخر موالیدِ ثلاثہ کے رُوپ میں ظاہر ہوئی، یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ طاقت مخصوص قوانین کے تحت پابندہ ہے۔ طاقت نے اِن قوانین کی سلاسل حدید کیونکر پگھلائی ہوگی؟ مادّہ اور طاقت ہمیشہ سے موجود تھے اور ہمیشہ موجود رہیں گے۔ آفرینش میں بھی ارتقا ممکن نہیں، ورنہ تمام سابقہ کڑیوں کو ختم ہو جانا چاہیئے۔ اور صرف ترقی یافتہ اور اعلیٰ اقسام کو موجود رہنا چاہیئے تھا۔
موالیدِ ثلاثہ میں مماثلت اسقدر ہے کہ ہم استعجاب سے گزر کر ایقان کے ساتھ اس رشتۂ مواخات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں اور پھر فرض کرتے ہیں کہ ارتقا ہوا ہے۔ حتّٰی کہ نباتات یا جمادات یا عالم حیوانات اپنے قوانین کے پھندوں میں گرفتار ہیں۔ اگر موالیدِ ثلاثہ میں مماثلت ہے تو وہ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ "ہستی" کسی فطین قوت کی تخلیق ہے۔ موالیدِ ثلاثہ ہمیشہ سے موجود تھے اور ہمیشہ موجود رہیں گے۔ دراصل ارتقا نامکمل ہے۔ مکمل ہونے کی ایک اَبدی اور لازوال خواہش ہے۔ لیکن جو چیز اپنی ضرورت، موقعہ اور محل کے مطابق اکمل ہو، اُسے مقاومت کی کیا ضرورت محسوس ہوسکتی ہے؟ دُنیا میں ہر ایک چیز کوششِ ناتمام سے زندہ نہیں بلکہ قوانینِ قدرت

کی متابعت سے زندہ ہے۔ کوئی راز کارگاہِ ہستی جو اہلِ شعور پر منکشف ہوا تو موجد اور محقق ہونے کا دعویٰ کر بیٹھے۔ چاند پر اگر مصنوعی سیّارہ بھیجا تو ایک خاص رفتار پر جو کششِ ثقل کے تابع اور فطرت کے اُصولوں کے مطابق ہے۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ فطرت کے قوانین کی پابندگی ہمارے بس میں ہے، اُنہیں بدل دینا ہماری استطاعت نہیں۔ ہم فطرت کے مسلّمہ اُصولوں پر عمل کرکے کوئی خاص نتیجہ برآمد کرتے ہیں اور اُسے ایجاد کہتے ہیں حالانکہ وہ صرف انکشاف ہوتا ہے۔

عصرِ حاضر کے مشہور فلسفی اور سائنسدان آئن اِسٹائن نے انکشاف کیا ہے کہ کائنات میں نہ تو اضافہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کمی۔ کائنات محدود اور معین ہے اور یہ ان معنٰی میں ممکن ہے کہ ہماری آفاقی قدریں قطعی اٹل اور مدام ہیں۔ البتہ آفاقی قدروں کو جانچنے کے لیئے ایک دوسرے میں تناسب قایم کرنے کی ضرورت ہے۔

اِس مقام پر اس سوال کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اگر فطرت ارتقا کی قایل نہیں اور ہستی قوانین کے تابع ہے اور کائنات کوششِ ناتمام سے نہیں بلکہ فطرت کے مسلّمہ اُصولوں سے قایم ہے، تو پھر انسان کا اختیارِ تمیزی کیا معنٰی رکھتا ہے؟ اگر خالقِ کائنات نے ہستی کو ازلی اور اٹل قوانین کے تابع کر دیا ہے، جن کے حلقۂ اثر کو نہ تو خفیف کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی جن سے تجاوز کی گنجایش ہے،

تو اِس کائنات کو مسخّر کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر ہم کشاکش و استقرا سے خوارقِ عادات نتائج حاصل کرنے میں ناکام و نامُراد ہیں تو فطرت کو مفتوح بنانے کی سعی لاحاصل کیوں؟ ہستی کوششِ ناتمام سے کیسے زندہ ہے؟ انسان کس مساعیِٔ جمیلہ کا متمنّی ہے؟ اگر ہمارے لاکھوں برس کے تجربات مُدوّن ہونے کے باوجود حقیر زادِ راہ ہیں تو ہم ان منطقی راہوں پر کیوں گامزن ہیں؟ ہم کس منزل پر پہنچنا چاہتے ہیں؟ کیا انسانیت سے ارفع تر اور اعلیٰ بھی کوئی منزل ہے؟ اگر نہیں تو انسانیت کا نصب العین کیا ہے؟ کیا اِنسانیت اپنا نصب العین خود متعین کر سکتی ہے یا وہ نصب العین بھی فطرت کا مقرر کردہ ہے؟

آپ اگر اِن سوالات کی تہہ تک پہنچنا چاہیں تو بغیر کسی ذہنی اشتقاق و مجاہدہ کے روز مرّہ کی زندگی کا غور سے مشاہدہ کریں اور دیکھیں کہ فطرت کیسے خود بخود اس معمّہ کا تصفیہ کرتی ہے!۔

طفلکِ نادان نہایت معصومیت اور سادگی سے اپنے گرد و نواح کے متعلق پُوچھے گا۔ آخر کیوں؟ لاتعداد برگ و گیاہ و خار و خس کیوں اس طرح متعجب نہیں ہیں؟ عصافیر حیوانات اور حشرات الارض کیوں صرف جبلتوں سے زندہ ہیں؟ وہ کیوں اپنے ماحول سے متاثر نہیں ہوتے؟ انسان کو مُستثنیٰ قرار دیجئے اور پھر سوچئے موالیدِ ثلاثہ میں قوتِ استعجاب اس قدر عدیم و نایاب کیوں ہے؟ صرف

اِنسان کی نگاہِ تحیّر رموزِ فطرت کی رنگینیٔ ادا پر سرخوش و سَرشار کیوں ہے ؟ کیا خالقِ کائنات نے اِنسان کو قوتِ استعجاب اِس لیئے بخشی کہ وہ معرفت حاصل کرے۔؟

ہماری تمام تر سعیٔ لازوال تو اِس لیئے ہے کہ ہم تو بر تو پردے ہٹا کر شادابیٔ حسنِ ازل سے اپنی پژمُردہ اور تشنہ کام نگاہِ شوق کو سیراب کریں، اِسے پھر جو بندگی بخش دیں اور ہر نئی جلوہ گری پر شعلۂ آرزُو کی مدّھم لو کو اِس قدر تیز کریں کہ ہجومِ تجلّی کی بے پناہ یلغار کے سامنے رموزِ فطرت کی تاریکیاں ہتھیار ڈال دیں۔ یہ کامرانی کی منزل ہے۔ صوفیائے کرام نے اسے معرفت اور عرفان کہا ہے۔ فلسفی کے الفاظ میں سحر طراز قوتِ استعجاب کی بدولت ضنطۂ غیب سے آفاقی اقدار کے غنچہ ہائے نازک نِکال کر انسان نے انھیں جوششِ نمُو عطا کیا اور خُونِ تمنّا سے ایسی کاوشِ جگری کے ساتھ سینچا اور شبستانِ وجود میں کچھ ایسے گُل کِھلائے، کچھ ایسی گُلکاریاں کیں کہ صحرائے تجسُّس کو دیکھ کر جب بہارِ گلفام آتشیں نگار جشنِ شاہانہ مناتی ہوئی چمنستانِ آرزُو سے گُزری اُس کی نظر جوشِ عقیدت سے شرما گئی۔

پس رموزِ فطرت کو پالینا اور عرفان اور معرفت حاصل کرنا ادب عالیہ اور فنونِ لطیفہ کا زرّین نصبُ العین ہے!

○

"رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!"

اقبالؒ

بابِ پنجم

ہم اِس نتیجہ پر پہنچے کہ شعورِ انسانی نئی منزلوں کی تلاش میں ہے
اس شورش و تگاپو کی تلافیٔ مافات اِس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے
کہ رہوارِ استعجاب کو بادیہ پیمائی کے لیئے نت نئی جولانگاہ میسّر ہے۔
اِس صحرائے ذخار میں وہ نخلستانِ آرزو کونسا ہے، جہاں یہ سمندِ شوق
رُکے ہ کسے معلوم، یہ گم کردۂ منزل ریگ زارِ تجسس میں صرف اپنی
وحشت پنہاں لیئے، اپنا سوزِ درُوں سنبھالے خمِ کاکُل سے شدید
جادۂ کٹھن پر بھی یُوں محوِ رفتار ہے جیسا کہ وہ چاہتا ہے۔

"ہمت بلند چنگل ازیں تیز تر بدو"

پس جیسا کہ ہم نے سابقہ باب میں نتیجہ اَخذ کیا ہے کہ اِنسانیت

کا منشا فطرت کو مسخر کرنا نہیں بلکہ فطرت کو سمجھنا ہے۔ تمام علوم و فنون کی بنیاد اسی جذبہ پر قایم ہے۔

اس لیئے ادب عالیہ اور فنونِ لطیفہ کا مقصد بھی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ ادب جو آفاقیت کا علمبردار نہیں کسی بھی صورت میں ادبِ عالیہ نہیں ہو سکتا۔ وہ فن پارہ جو آفاقیت کا آئینہ دار نہیں، فنونِ لطیفہ کہلانے کا مستحق نہیں۔

ہم فنونِ لطیفہ یا ادبِ عالیہ کی طبقاتی تقسیم نہیں کر سکتے وہ ایک غیر فطری اقدام ہوگا۔ فنونِ لطیفہ اور ادبِ عالیہ کا سرچشمہ آفاقی اقدار ہیں۔ انہیں سمجھ لینا اور ان کی ترویج و اشاعت ادب عالیہ کا زرین نصب العین ہے۔ فنونِ لطیفہ اور ادبِ عالیہ کی تخلیق ایک فطری عمل ہے اور آفاقیت اس کی محرک ہے۔ ہم اسی جذبہ کی بدولت زندہ ہیں۔ انسانی جبلتیں اپنے ماحول سے شدید طور پر متاثر ہوتی ہیں اور اس تاثر کا اظہار فنونِ لطیفہ یا' ادبِ عالیہ کہلاتا ہے۔ چونکہ ہماری جبلتوں میں نسل یا فرقہ یا قبلیہ یا ملک کی بنا پر کوئی افتراق نہیں اور اگر کوئی فرق ہے تو وہ نشو و نما کا ہے۔ انسانی جبلتیں یکساں طور پر افراد میں ودیعت ہوئی ہیں۔ اس لیئے ہمارے تمام جذبے آفاقی ہیں۔ اور یہ جذبے جس تفکر کو جنم دیں گے وہ بھی آفاقی ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ادبِ عالیہ اور فنونِ لطیفہ کا صرف ایک ہی معیار ہے اور وہ ہے آفاقیت۔ اِس کسوٹی پر ہی کسی شہ پارے

یا فن پارے کو پرکھا جا سکتا ہے۔ جذبۂ محبت کو لیجیے، وہ آفاقی ہے، جذبۂ نفرت کو لیجیے وہ آفاقی ہے، جذبۂ حسد کو لیجیے وہ بھی آفاقی ہے۔ ہمارے حواسِ خمسہ کو لیجیے، کون ہے جو کسی مخصوص قبیلہ کسی خاص نسل یا قوم یا ملک سے تعلق رکھتی ہے؟ اِن میں کیا ہے جو آفاقی نہیں؟

جو لوگ ادبِ عالیہ یا فنونِ لطیفہ کی طبقاتی تقسیم کرنا چاہتے ہیں، اُن کے پاس ایسا کرنے کا کیا جواز ہے؟

ہمیں تسلیم کہ تان سین کے فن کی داد موسیقی سے آشنا کان ہی دے سکتے ہیں۔ اُس کے فن کی باریکیاں کسی وحشی کے ذوقِ سماعت کے لیے بارِ گراں بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔ پال روبسن کی نغمہ سرائی کسی بہرے یا گونگے کی نظروں میں کیا وقعت رکھ سکتی ہے؟ فان گاگ کی مصوری سے حظ نگاہِ باریک بیں ہی اُٹھا سکتی ہے۔ لیکن اگر غور کیجیے، فرق اقوام و ملل کا نہیں۔ بلکہ صرف جبلتوں کی نشو و نما کی ضرورت ہے۔ پھر نہ تو تان سین ہندوستانی رہتا ہے اور نہ پال روبسن امریکی یا فان گاگ فرانسیسی رہتا ہے۔

تان سین کی موسیقی سے متعلق حکایت ہے کہ وہ زخمہ ور بربطِ دل کے ہر تارِ شکستہ کو یوں طاقتِ گویائی بخشتا اور ایسے مجروح نغمے الاپتا کہ سنگ و خشت تک سوزِ زندگی سے دردآشنا معلوم ہوتے، اور فضائے بسیط کے طائرانِ آزاد کا ذوقِ تکلم۔

یاس و اُمید کی زنجیر لیئے اِن معصومانِ فطرت کو اسیرِ محفل بنا دیتا۔ اور شمعِ گُشتہ فروزاں ہو کر شمعِ شبستاں بَن جاتی، جس کی کششِ حُسنِ غم، لاتعداد پتنگوں اور پَروانوں کو قِصّۂ بے نیازئ حُسن اور افسانۂ بے تابئ عشق کی تجدید پر آمادہ کرتی۔

بالکل اِس طرح برسوں بیت جانے کے بعد بھی مرقع فان گاگ میں شاخِ گُل کی آتشِ خنداں آج بھی شرر بار نظر آتی ہے، اور ہم پر ایسی کیفیتِ افسون طاری ہوتی ہے۔ یعنی اقبال کی زبان میں :-

"نظارے کو یہ جُنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی"

پال روبسن کی نغمہ سرائی ہماری رُوحِ گرفتار کے ہر حلقۂ زنجیر کی گرہ کھول دیتی ہے۔ یہ لوگ آفاقیت کے علمبردار ہیں۔ اِن کا کوئی مُلک نہیں۔ ان کی کوئی قوم نہیں۔ یہ کسی قبیلہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ اِن کا مذہب اِنسانیت ہے۔ اِن کے جذبات و تفکر آفاقی ہیں۔ اِن کا کردار آفاقی ہے۔ یہ غالب کی طرح قطرہ میں دجلہ دیکھنے کے متمنّی ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ ہر فردِ واحد بذاتِ خود اِک محشرِ خیال ہے۔ یہ فردِ واحد کی ذات کی اہمیت کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یہ اس کی اِنفرادیت کو قایم رکھ کر انسانیت کو آفاقیت کا سبق سکھاتے ہیں۔ آخر افراد سے ہی تو دُنیا قایم ہے! دانشورانِ عالم کی باریک بین نگاہیں بغیر کسی تعویق کے اِن نُکتہ ہائے دقیق کو جان لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب عالیہ اور فنونِ لطیفہ کے

تخلیق کار نے ہمیشہ فردِ واحد کو منتخب کیا۔ ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ آج کے ادیب اور آرٹسٹ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ فردِ واحد کو نظر انداز کر رہا ہے اور اس کے بجائے گروہ، اجتماع اور طبقات پہ زور دے رہا ہے۔ شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ادب کی تخلیق سیاسی مصلحتوں کی بنا پر نہیں کی جا سکتی۔ شخصیت اپنی منفرد حیثیت کے باوجود عالمِ انسانی کی ترجمان ہوا کرتی ہے۔ اس کا ثبوت اگر آپ چاہیں تو شیکسپیئر کے لازوال ڈرامہ ہملٹ سے طلب کیجیئے۔

ہملٹ کو غائر نگاہ سے دیکھیئے کہ وہ انسانی جذبۂ غم کی کیفیتوں سے بھرپور ہے، جن سے ہم سب اپنی صاعقہ بردوش سی زندگی میں کبھی نہ کبھی آشنا ہوتے ہیں۔ اِس جذبہ کی ترجمانی ہملٹ سے بہتر کوئی کردار ڈرامہ کا نہیں کرتا۔

ہملٹ ایک دِل گرفتہ انسان کے پریشان دماغ اور رُوحِ بے تاب کی کہانی ہے جو شمعِ طاق کی طرح اپنے سوزِ دُروں میں پگھل پگھل کر فروزاں ہے۔ اُس کی رُوحِ بے تاب، پیکرِ محسوس تو کیا سینۂ سنگ کو آمادۂ اضطراب کر سکتی ہے۔ ہملٹ ایک موجِ بے قرار ہے، جس کا کوئی ساحل نہیں!

ہملٹ ایک ایسا ملّاح ہے، جس کی شکستہ ناؤ ہنگامۂ طوفان سے ہی سہارا مانگتی ہے!

ہملٹ ایک تشنہ کام ریگ زارِ ہستی میں اپنے بہروپ کے سرابوں سے سہارے کا متلاشی ہے۔

ہملٹ ایک ایسی بہار ہے، جسے شادابیِ چمن کا کچھ علم نہیں!

ہملٹ ایک ایسا راہی ہے جو اپنی ناکامیوں کو نشانِ راہ بناکر جادۂ ظفریابی کی تلاش میں ہے!

ہملٹ جذبات کا ایک آتش فشاں ہے جو وقتاً فوقتاً لاوا اُگاتا ہے۔ ہملٹ کو پڑھتے وقت ہماری بے حسی ایک قطرۂ بے بُود کی طرح فنا ہوجاتی ہے۔ ہم اُس کی مایوسی کو پہچان لیتے ہیں۔ ہم اُس کا درد جان لیتے ہیں۔ ہم اُس کے تذبذب کا احترام کرتے ہیں۔

ہملٹ ایک ایسا غبار آلود آئینہ ہے، جس میں صرف ہماری وحشتِ پنہاں کی پرچھائیاں نُمایاں ہیں!

ہملٹ ایک انسانی مقناطیس ہے جو ہماری غریزی کیفیات کے لیئے بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ وہ کسی مخصوص طبقے سے تعلق نہیں رکھتا۔ وہ نہ تو سرمایہ دار ہے اور نہ ہی جاگیردار اور نہ ہی مزدُور۔

وہ ایک انسان ہے، جسے اپنی کمزوریوں کا اعتراف بھی ہے اور اپنی قوتوں کا احساس بھی ہے۔

وہ ایک آفاقی کردار ہے!

یہ ڈرامہ کے فن کی معراج ہے کہ ڈرامہ نویس ایک فردِ واحد
کے کردار کو آفاقیت عطا کرکے اُسے تمام عالمِ انسانی کے جذبۂ
رنج و محن کا ترجمان بنا دیتا ہے۔

O

"یا مُردہ ہے یا نَزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خُونِ جگر سے"

اقبالؒ

حرفِ آخر

"مَیں نے آفاقیت جیسے کٹھن موضوع پر قلم اُٹھانے کی جُرأت کی ہے اور فنونِ لطیفہ اور ادبِ عالیہ کے آفاقی کردار کو آشکارا کیا ہے۔ مَیں نے ایک فلسفۂ حیات کو قاری کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، مجھے معلوم نہیں کہ قاری اسے مُردہ پائے گا یا نزع کی حالت میں گرفتار" ـــــ مَیں نے الفاظ کے پیچوں میں اُلجھنے سے بچنے کی ہر ممکن سعی کی ہے اور خیالات پیش کردہ پر میری ساری توجہ مرکوز رہی ہے، اِس اُمید پر کہ یہ خیالات قاری کے ذہن میں بھی ایسے ہی خیالات کی تولید کا باعث ہوں گے۔ اِس رسالے کے مضامین وقتاً فوقتاً قلم بَرداشتہ تحریر کیے گئے تھے۔ مجھے اپنی کمزوریوں کا اعتراف ہے۔ مجھے یہ بھی

یقین ہے کہ ان مضامین میں ادبی نقطۂ نظر سے خامیاں ہوں گی۔ لیکن قاری سے التماس ہے کہ وہ میری مشکلات کو مدِ نظر رکھے۔ ایک فلسفیانہ موضوع پر اُردو میں کچھ تحریر کرنا بہت ہی کٹھن کام تھا خیالات کے اظہار کے لیئے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ مقالہ لکھتے وقت مَیں نے اِن کی کمی کو شدّت سے محسوس کیا ہے۔ کئی باتیں ایسی بھی تھیں جو مَیں نے کہنا چاہیں اور نہ کہہ سکا۔ جہاں تک مضامین کا تعلق ہے، قاری سے یہ عرض ہے کہ باب اول، دوم اور سوم میں، مَیں نے ادبِ عالیہ اور فنونِ لطیفہ کے آفاقی کردار کا جائزہ سائینسی اور تاریخی پس منظر میں لیا ہے۔ لیکن جہاں تک باب چہارم کا تعلق ہے۔ اُس میں، مَیں نے اپنا نجی نقطۂ نگاہ پیش کیا ہے۔ اِس لیئے ہو سکتا ہے کہ اِس میں اور دیگر مضامین میں کچھ تضاد ہو۔ جہاں تک باب پنجم کا تعلق ہے، وہ عصرِ حاضر کے دانشورانِ نکتہ داں سے ایک مودبانہ گذارش ہے کہ وہ شخصیت کو نظر انداز نہ کریں۔ آفاقیت کی اساس شخصیت پر ہی قایم کی جا سکتی ہے"۔